رضا علی عابدی کے تجرباتِ سفر

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

RAZA ALI ABIDI'S TRAVELOGUE

AN ANALYTICAL STUDY

Waheed al Rahman Khan, PhD
Associate Professor of Urdu,
University of Education, Lower Mall Campus, Lahore

Abstract

This article is an analytical study of travelogues written by Raza Ali Abdi. Four of his travelogues namely Jarnaili Sark, Shayer Darya, Rail Kahani, Jahazi Bhai have been published till date. He has made experiments through them which are untraceable in other Urdu travelogues. The article not only focuses on these experiments but also sheds light on technique and style he has applied through them.

Keywords: رضا علی عابدی، قصہ خوانی بازار، حسن ابدال، کالا باغ، ٹھٹھہ، گوتم بدھ، بلتستان، سٹیم انجن، ماریشس

اردو سفرنامے میں تکنیک کی سطح پر متنوع تجربات کیے گئے ہیں۔ کہیں تجرباتِ سفر کو روداد یا رپورتاژ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور کہیں مکتوب یا روزنامچے کے انداز میں۔ کسی کی طبیعت شاعرانہ ہوئی تو اس نے منظوم سفرنامہ تحریر کردیا اور کسی کے مزاج میں شوخی ہوئی تو اس نے سیاحت کو ظرافت کا ہم معنی بنادیا۔ رضا علی عابدی نے سفرنگاری میں اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ انھوں نے کوئی نئی تکنیک ایجاد نہیں کی لیکن جن راستوں اور آمد و رفت کے ذریعوں کا انتخاب کیا، وہ ان کے امتیاز اور انفرادیت کا باعث ہیں۔ رستوں کے انتخاب نے انھیں اس 'منزلِ مقصود' تک پہنچادیا جس کی ہر سفرنگار تمنا کرتا ہے۔

رضا علی عابدی لندن میں مقیم ہیں اور بی بی سی میں ملازم۔ صداکاری کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اپنے ادارے کے خرچ پر سیر و سیاحت کرتے ہیں اور رودادِ سفر، سامعین کے گوش گزار کرتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں فرضِ منصبی اور شوقِ قلبی کی یک جائی۔ ''ہم خرما و ہم ثواب'' بھی غالباً ایسے ہی مواقع پر کہا جاتا ہے۔

عابدی صاحب نے اپنے ادارے کے سربراہ کی تجویز پر جرنیلی سڑک کو موضوعِ سخن بنایا۔ یہ پشاور کو کلکتہ سے ملانے والی گرینڈ ٹرنک روڈ ہے جو پندرہ سو میل طویل ہے۔ عابدی صاحب نے اس طویل سڑک پر شہر در شہر سفر کیا ہے۔ انھوں نے جرنیلی سڑک کو 'صراطِ مستقیم' کا درجہ نہیں دیا۔ گاہے گاہے وہ 'جادۂ حق' سے گم راہ ہوکر کسی اور سرزمین پر بھی جا نکلتے ہیں۔ کبھی کسی دیوار کے سائے تلے آرام کر لیتے ہیں اور کبھی کسی در کو بند پاکر الٹے بھی پھر آتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے مقصدِ اولیٰ سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ ان کا اولین مقصد جرنیلی سڑک کے راستے میں آنے والے علاقوں اور زمینوں کی داستان بیان کرنا ہے۔ اس داستان میں روایتیں ہیں، حکایتیں ہیں اور حقیقتیں بھی۔ عابدی صاحب نے تاریخی حقائق کو اگرچہ خاص اہمیت دی ہے اور معلومات کی فراہمی سے سفرنامے میں علمی، تاریخی اور تحقیقی شان پیدا کرنے کی سعی کی ہے، تاہم مجلس آرائی کے نقطۂ نظر سے انھوں نے روایتوں اور حکایتوں کو زیادہ توجہ سے ساعت کیا ہے۔ وہ لوگوں سے شہر کے تمدن، معاشرت، معیشت، رسومات اور تہذیب و ثقافت کے

بارے میں استفسار کرتے ہیں اور جوابات کو افسانوی پیرائے میں رقم کر دیتے ہیں۔ ان کا ذوقِ استفہام بعض اوقات اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ انشاء اللہ انشا کی یاد تازہ ہوجاتی ہے کہ جو طفلانِ شہر سے لطیفہ گوئی کا تقاضا کرتے تھے۔

عابدی صاحب کا سفرنامہ جرنیلی سڑک جہاں ایک وسیع 'انسانی اجتماع' کے احوال و آثار کا ترجمان ہے، وہاں یہ سنگ وخشت سے پیدا ہونے والے جہانوں کی خبر بھی سناتا ہے۔ عابدی صاحب نے راہ میں آنے والی دیواروں، دروازوں، بازاروں، مقبروں، مسجدوں، گرجوں اور قلعوں کو بھی جیتے جاگتے انسان خیال کیا ہے اور ان کی سرگوشیوں کو بھی سننے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ان قابلِ دید مقامات کی فہرست درج کی جارہی ہے:

قصہ خوانی بازار، بالا حصار کا قلعہ، بابا ولی قندھاری کی چلہ گاہ، مغل بی بی کی قبر، خواجہ شمس الدین خوانی کا مقبرہ، شاہ فیصل مسجد، قلعہ رہتاس، حویلی مان سنگھ، شاہ دولہ کا مزار، رام پیاری کا محل، بادشاہی مسجد، انارکلی بازار، حضرت توکل شاہ نقش بندی کی درگاہ، سینٹ پال کا گرجا، ڈیری فارم کا مزار، بوعلی شاہ قلندر کا مقبرہ، لال دروازہ، کابلی دروازہ، خونی دروازہ، شیر منڈل، شیر شاہ کی مسجد، شیخ سلیم چشتی کا روضہ، پنج محل، آنکھ مچولی، اکبر کا مقبرہ، تاج محل، قلعہ آگرہ، ہنومان جی کا مندر، سینٹ جوزف کا گرجا گھر، اورنگ زیب کی مسجد، گنج شاہ کی مسجد، شیتل ناتھ جی کا مندر، کالی دیوی کا مندر، مسجد ناخدا!!!

عابدی صاحب کا اندازِ تعارف ملاحظہ ہو کہ وہ کس طرح کسی شہر کی قدیم عمارات اور مقامات کے بیان میں روایات اور حکایات کو ملحوظ رکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ حسن ابدال رونق کی اور عبرت کی جا ہے۔ دونوں طرف انگریزوں کے زمانے کے اونچے اونچے درخت، دور تک سبزہ، نالیوں میں بہتا ہوا چشمے کا شفاف پانی، اِدھر اُدھر پرانی عمارتیں اور مسجدیں، ایک طرف سکھوں کا مشہور گوردوارا پنجہ صاحب، دوسری طرف بابا ولی قندھاری کی چلّہ گاہ، کشمیر کی طرف مڑ جانے والی سڑک پر کسی مغل بی بی کی قبر۔ کوئی کہتا ہے کہ اکبر کی بیٹی

لالہ رخ تھی۔ وہ یہاں عالمِ شباب میں مرگئی تھی۔ بعد میں طامس مور نے اپنی ایک نظم میں اسے زندہ کردیا۔

یہیں قلعہ اٹک کے معمار خواجہ شمس الدین خوانی کا مقبرہ ہے جو اس نے اپنی زندگی میں تعمیر کرایا تھا مگر وہ کہیں دور مرا اور یہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔ اس کے برعکس اکبر کے چہیتے مصاحب اور محرمِ راز حکیم ہمام نے کہیں دور وفات پائی لیکن بادشاہ کے حکم پر اس کی میت حسن ابدال لے جا کر اس کے بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی کے پہلو میں دفن کی گئی۔ حسن ابدال کے قریب اس مغل باغ کے آثار اب بھی موجود ہیں جس کے تالاب سے جہانگیر نے مچھلیاں پکڑی تھیں اور ان کی ناک میں موتی پرو کر پھر پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ یہیں وہ بڑی سی چٹان ہے جس کے بارے میں سکھوں کا عقیدہ ہے کہ اسے بابا ولی قندھاری نے پہاڑی کے اوپر سے لڑھکا دیا تھا اور نیچے بابا گرونانک نے چٹان کو اپنے ایک پنجے پر روک لیا تھا۔ چٹان پر نانک کے پنجے کا نشان بن گیا تھا جو آج تک موجود ہے۔ تاریخ کا حساب کتاب رکھنے والے کہتے ہیں کہ جب گرونانک پشاور جاتے ہوئے حسن ابدال آئے تھے، بابا ولی قندھاری اس سے بہت پہلے نہ صرف حسن ابدال سے بلکہ اس عالمِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ پانچ انگلیوں کا یہ نشان حسن ابدال والوں نے تراشا تھا۔‘‘(۱)

جرنیلی سڑک ایک ایسا سفرنامہ ہے جس میں راہی اور راستے کی متحرک تصویر پیش کی گئی ہے۔

شیر دریا میں عابدی صاحب نے دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کیا ہے۔ روداد سفر میں انھوں نے موجوں کی روانی اور کناروں کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک دریا کے آغاز و انجام کی داستان بھی ہے۔ یہ داستان لداخ سے شروع ہوتی ہے جو دریا کا نقطۂ آغاز ہے اور جسے وہاں کے ’انسان‘ شیر تصور کرتے ہیں۔ مصنف شیر دریا کی ہم راہی میں لداخ کے مختلف دیہاتوں ’اپشی، لیہ اور کھلے‘ سے گزرتا ہے اور پھر ہر لہر اور ہر قدم پر مختلف شہر اور ویرانے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ کہیں ویرانوں میں شہر آباد ہیں اور کہیں شہروں میں کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ دریا کوئے لداخ سے نکلتا ہے اور سوئے سمندر رواں دواں رہتا ہے۔ کناروں پر مختلف مقامات ہیں جن کے مختلف نام ہیں سکردو،

بلتستان، کالاباغ، داؤدخیل، میاں والی، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، سکھر، لاڑکانہ، موہنجوداڑو، سیہون شریف، حیدرآباد، ٹھٹھہ____ ناموں کی طرح ان علاقوں کی آب وہوا، رسوم ورواج، زبان وبیان اور تہذیب وثقافت بھی مختلف ہے۔ تاہم کچھ قدریں مشترک بھی ہیں، مثلاً غربت، جہالت اور بے روزگاری وغیرہ۔ عابدی صاحب نے ان تمام اقدار وروایات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے خواہ ان میں کچھ اختلاف کے پہلو نکلتے ہوں یا اشتراک کے۔ عابدی صاحب نے اپنے تمام سفرناموں میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔

اپنے دیگر سفرناموں کی طرح عابدی صاحب یہاں بھی ''پر مجھے گفت گو عوام سے ہے'' کے اصول پر کاربند رہے ہیں۔ وہ دریا کے کنارے آباد شہروں کے افراد سے مکالمہ کرتے ہیں اور شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ عوام سے ان کے پسندیدہ سوالات، تعلیم کی صورتِ حال اور قدیم وجدید زمانے کے تقابل کے بارے میں ہوتے ہیں۔ یہ سوالات اتنی تکرار سے کیے گئے ہیں کہ کبھی کبھار صورتِ حال خاصی مصنوعی اور میکانکی محسوس ہوتی ہے۔ تاہم ان کم زور لمحوں میں بھی ان کی نیک نیتی اور تجسس کی فراوانی، شک وشبہ سے بالاتر رہی ہے۔ ان کے پسندیدہ سوال اور 'جواب تلخ' کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

''اب میں نے موضوع بدلا'' اور تعلیم کا کیا حال ہے؟''

''یہاں پر ایک ہائی اسکول ہے۔ یہ پہلے مڈل اسکول تھا اب اُسے ترقی دے کر ہائی اسکول بنایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی پرائیویٹ اسکول نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا ''یہاں لڑکیوں کی تعلیم ہے؟''

جواب ملا ''لڑکیوں کی تعلیم کوہستان میں بالکل نہیں ہے۔ اگرچہ لڑکیوں کے اسکول جگہ جگہ بنے ہیں مگر خود داسو میں جو لڑکیوں کا اسکول ہے اس میں دس بارہ، زیادہ سے زیادہ پندرہ لڑکیاں ہیں''۔

''اور گنجائش کتنی ہے؟''

''گنجائش تو بہت زیادہ ہے۔تقریباً دوسولڑکیوں کی گنجائش ہے۔''

''والدین نہیں پڑھواتے کیا؟''

''نہیں۔یہاں لڑکیوں کو پڑھوانے کا تصور ہی نہیں ہے کیوں کہ یہاں روایت یہ ہے کہ لوگ لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھتے ہیں۔اسی لیے لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کی لڑکیاں اسکول میں پڑھیں بل کہ سچ پوچھیے تو لڑکوں کے بارے میں بھی ابھی تک یہی تصور تھا کہ ان کو نہیں پڑھانا چاہیے۔''(۲)

ایک اور سوال جو عابدی صاحب کو دورانِ سفر میں اکثر پریشان کیے رہتا ہے وہ ''زمانے کے انداز بدلے گئے'' سے متعلق ہے۔مسئولین انھیں جب یہ جواب دیتے ہیں کہ ماضی کا چہرہ روشن تھا اور صورتِ حال تاریک تر ہے تو ان کا چہرہ کھل اٹھتا ہے مگر کبھی کبھار انھیں خاطر خواہ جواب موصول نہیں بھی ہوتا۔

یہ سفرنامہ جہاں شہروں کے حوالے سے معلومات پیش کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ انسانوں کے بارے میں آگاہی فراہم کرتا ہے۔شیر دریا میں انسانوں کے ایک ایسے سمندر کی تصویر کھینچی گئی ہے جن کی صورتیں، زبانیں اور حالتیں مختلف ہیں۔یوں یہ سفرنامہ ایک نئی طرز کا ''آدمی نامہ'' بھی ہے جسے نثر میں تحریر کیا گیا ہے۔عابدی صاحب کے سفرناموں کا کاروبار انھی لوگوں کے دم سے چلتا ہے جن سے ان کی سرِ راہ یا سرِ بزم ملاقات ہوتی ہے۔

عابدی صاحب عوام کے مسائل اور مصائب کے بارے میں ہم دردانہ نقطۂ نظر کے حامل ہیں، خاص طور پر شہر کی کم زور معیشت اور بے روزگاری انھیں مضطرب رکھتی ہے چناں چہ وہ مقامی افراد سے شہر کی اقتصادی صورتِ حال کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں:

''ہوٹلوں کے ملازموں سے باتیں کرتے کرتے میں اہلِ شہر میں گھل مل گیا۔سیہون شہر کی باتیں ہونے لگیں۔یہ عجیب وغریب شہر ہے۔یہاں کوئی صنعت نہیں، کوئی کاروبار نہیں، سرکاری دفاتر نہیں۔یہاں کی معیشت کا دارومدار زائرین پر ہے جو خدا جانے کہاں کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر روز دس ہزار افراد سیہون آتے ہیں۔

میری ملاقات صفدر سے ہوئی جو سیہون میں رہتے ہیں البتہ حیدرآباد کے پولی ٹیکنیک میں تعلیم پاتے ہیں۔ میں نے صفدر سے پوچھا کہ اس شہر میں روزگار کی کیا حالت ہے؟ یہاں کے نوجوان کیا کرتے ہیں؟

''جی یہاں کوئی روزگار یا کارخانہ وغیرہ نہیں ہے جہاں یہ نوجوان مصروف رہیں۔''(۳)

مصنف نے سفرنامے میں علاقے کی زراعت کو بھی موضوع بنایا ہے کیوں کہ دریا کا زمینوں اور فصلوں سے براہِ راست تعلق ہے:

''کوٹڑی بیراج بننے سے پہلے یہاں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جو آج دریا کے کنارے ہیں تو کل کسی بستی میں چلے گئے۔ کسی نے بویا۔ ملا نہیں ملا، مگر اب تو ماشاءاللہ بہت اچھی نہریں بنی ہیں۔ لوگوں نے اپنے پڑاؤ کو مستقل بنا دیا ہے اور فصل اور موسم کے لحاظ سے کاشت کرتے ہیں۔ ہمارے ضلع ٹھٹھہ میں ماشاءاللہ ایسی کاشت ہونے لگی ہے کہ ہم لوگوں کو خود اندازہ نہیں تھا۔ یہاں گنے، کیلے، دوسرے پھلوں اور سبزیوں کی ایسی کاشت ہونے لگی ہے جو باقی سندھ میں نہیں ہو سکتی۔ سمندر کے قریب قریب سارے علاقے میں اتنی اچھی کاشت ہوتی ہے کہ خود حیران ہیں۔''

ہم بھی حیران ہیں کہ دریا میں پانی کم ہے تو یہ حال ہے، اگر کہیں نہریں بھر بھر کر پانی لے جاتیں تو یہی زمینیں سونا اُگلتیں۔''(۴)

دورانِ سفر، مذاہب اور مسالک بھی عابدی صاحب کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ انھوں نے کسی مذہبی بحث کو چھیڑے بغیر، مذاہب کی تاریخ کو معروضی انداز میں بیان کیا ہے لیکن کبھی کبھی ان کا دل غم سے بھر بھی آتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے جس میں بلتستان اور دیگر علاقوں میں اسلام سے قبل کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ آج بلتستان میں گوتم بدھ کو ماننے والا کوئی نہیں۔ بودھ عقیدہ یہاں کافی عرصے پہلے ختم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے کا تعلق کافی عرصے گندھارا یعنی پشاور کی وادی اور چین کے ساتھ رہا ہے بل کہ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ تبت اور لداخ میں بودھ مذہب اسی

علاقے سے سوات اور گلگت کے راستے بلتستان سے ہوتا ہوا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ پدم سمبھو، جو بہت بڑا بزرگ گزرا ہے، بودھ مت یہاں سے لے کر وہاں گیا لیکن بعد میں ۱۰۰۰ء کے قریب پھر ہندو عقیدے کا تسلط ہوا اور وشنو، شیوا اور کرشنا کی پوجا ہونے لگی اور سورج کی پرستش شروع ہوگئی۔ اس زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بودھ عقیدے کا زور کم ہوگیا اور ہندو عقیدہ آگے نکل گیا۔ اسلام یہاں پر بہت بعد میں آیا۔ خاص طور پر گلگت، چلاس اور کوہستان میں اسلام چودھویں اور پندرھویں صدی سے پہلے نہیں آیا۔ اس وقت تک یہاں مذہبوں کا ملغوبہ سا رہا جس میں بدھ ازم کم اور ہندو ازم زیادہ تھا۔ یہ بھی ہوا کہ یہاں بودھ باشندے جتنے بھی تھے وہ سارے سنکیانگ، چین یا تبت چلے گئے۔ بلتستان میں بدھ ازم کے اثرات کافی عرصے رہے مگر چودھویں صدی میں جب اسلام آیا تو پوری آبادی نے اسلام قبول کیا اور بدھ ازم کا خاتمہ ہوا''۔(۵)

عابدی صاحب نے عورت کو بھی توجہ کی نظر سے دیکھا ہے مگر واضح رہے کہ توجہ کا مرکز 'حسنِ زن' نہیں بل کہ 'مسئلۂ زن' ہے۔ جس کی ذیل میں عورت کی صحت، تعلیم اور حقوق آتے ہیں:

''یہ عورتیں بہت زیادہ محنتی ہیں، بے انتہا محنتی ہیں۔ ان کو گھر میں بھی کام کرنا پڑتا ہے اور گھر کے باہر بھی۔ گھر میں کھانا پکانا سب ان کے ذمے ہے۔ اس کے بعد باہر جا کر کھیتوں میں سارا سارا دن محنت کرتی ہیں، مویشی کی بھی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اوپر سے یہ کہ سب سے چھوٹا والا بچہ چادر میں لپٹا ان کی پیٹھ پر سوار رہتا ہے۔ یہ رسم صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ عورتیں رات دن مشقت کر رہی ہیں اور دودھ پیتا بچہ ان کی پیٹھ سے بندھا ہوا ہے۔ خود عورتوں کا یہ حال ہے کہ جوار بوتی ہیں، اگاتی ہیں، کاٹتی ہیں، صبح تڑکے اٹھ کر جانوروں کو چارا دیتی ہیں۔ ان کا دودھ دوہتی ہیں۔ دودھ نکالنے کے بعد اس سے مکھن نکالتی ہیں، دہی بناتی ہیں، لسی بناتی ہیں۔ ان لوگوں کا ناشتہ بھی اسی لسی اور مکی کی روٹی سے ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی روٹی بناتی ہیں اور پورا کنبہ وہی روٹی کھاتا ہے۔ تھوڑا بہت ناشتہ خود کیا، باقی گھر والوں کو کرایا، بس اس کے بعد دن بھر کی مشقت شروع ہو جاتی ہے۔''(٦)

عابدی صاحب نے سفرنامے میں منظر نگاری کم اور 'مردم نگاری' زیادہ کی ہے۔ فطرت کے

مناظر کی تصویر کشی میں انھوں نے اپنے زورِ قلم کو زیادہ نہیں آزمایا تاہم جب وہ کبھی 'مائل بہ قلم' ہوتے ہیں تو منظر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے:

''ہم آگے بڑھے اور جوں ہی کندیاں سے باہر نکلے دریائے سندھ نظر آنے لگا۔ چمکتی دھوپ میں اس کی ریت جگمگانے لگی۔ کہیں نیلا پانی بہہ رہا تھا، کہیں گرم ریت دہک رہی تھی۔ چناں چہ ہوا کے گرم اور ٹھنڈے جھونکے بھی آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ البتہ اونچے درختوں کے سایوں کی راحت بٹورتے ہوئے ہم ایک بہت بڑی آبادی، بہت بڑے شہر کے قریب جا پہنچے۔ ہر طرف کوٹھیاں، بنگلے، باغ، ریسٹ ہاؤس، اونچی نیچی چھوٹی بڑی عمارتیں، فلیٹ اور گھر وندے، نہریں اور چشمے، مگر سناٹا۔ ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد۔ جیسے ہالی ووڈ کی کسی بڑی فلم کا سیٹ لگا ہو مگر اداکار موجود نہ ہوں۔۔۔

دریا پار اتر کر ہماری کار کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ کوہِ سلیمان کے سلسلے کے اونچے نیچے پہاڑ ہمارے ساتھ دوڑتے ہوئے لگے کہ اچانک منظر بدلا۔ دو رویہ کھجور کے درخت نظر آنے لگے، بہت پرانے گھنے کھجور کے درخت۔ اونچے پشتوں کے پیچھے دوڑتی ہوئی نہریں۔ پشتوں کے اوپر چلتے ہوئے چرواہے اور ان کی ڈھلانوں پر چرتے ہوئے ان کے مویشی۔ کہیں کہیں مٹی ڈھونے اور زمینیں کھودنے والی دیوہیکل مشینوں کے لاشے جنھیں اب زنگ کھائے جا رہا تھا۔ دور دور تک سنگلاخ میدانوں میں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے یہ بڑے بڑے شہروں کے کھنڈر ہیں۔'' (۷)

سفر نگار نے وطن کی سیاست کا حال بھی رقم کیا ہے۔ انھیں سیاست کے معاملات میں زیادہ دل چسپی نہیں ہے مگر اہلِ سیاست کی اداؤں پر وہ غور بھی کرتے ہیں اور شکایت بھی۔

عابدی صاحب کا یہ سفرنامہ جہاں شیر دریا کی روانی کو پیش کرتا ہے، وہاں ان کی اپنی طبیعت کی روانی کو بھی ظاہر کرتا ہے اور کناروں کی کہانی کو بھی!

ریل کہانی ایک ایسی کتاب ہے جس میں راکب نے مرکب کی داستان بیان کی ہے۔ عجیب سفر ہے کہ جس میں مرکب آگے کی جانب روانہ ہے اور راکب، گردشِ ایام کے ہم راہ پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ یہاں 'فاصلے' اور 'زمانے' کے مابین ایک دل چسپ مساوات مبنی دکھائی دیتی ہے۔

ظاہر میں رضا علی عابدی ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، کوئٹہ سے کلکتہ تک، مگر دوسری جانب وہ تاریخ کے ڈبے میں بھی موجود ہیں اور ہم سفروں کو ٹرین کی ایجاد اور آغاز کے بارے میں ایک حکایتِ دل پذیر سنا رہے ہیں۔

اہلِ دل کے لیے ٹرین کا سفر ایک رومانوی تجربہ ہے۔ ٹرین کی سیٹی کی آواز نالۂ نے سے کم نہیں اور اسٹیشن پر وداع و وصل کے جذباتی مناظر بھی دل و نگاہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ٹرین محض ایک سواری کا نام نہیں بل کہ یہ ایک تہذیب، ایک ثقافت کا عنوان بھی ہے۔ ٹرین کا ایک مختصر سا ڈبہ، ایک مخصوص ثقافتی نظر نامے کا ترجمان ہوتا ہے جو انسان کی داخلی تنہائی اور نامعلوم رشتوں کی یک جائی سے وجود میں آتا ہے۔ رضا علی عابدی نے اس معاملے کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"ریل گاڑی کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ شہر کی وہ سڑک جو ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑتی ہے، اُس پر مڑتے ہی نہ صرف ماحول کی بل کہ مڑنے والے کے شعور کی کیفیت بھی بدلنے لگتی ہے۔ وہیں سے فضا کے رنگ اور ہوا کی بو بدلنے لگتی ہے اور پھر اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھتے ہی اور ریل کے ڈبے میں داخل ہوتے ہی نہ صرف احساس بدلتا ہے، احساس کا مالک بھی بدل جاتا ہے۔ ریل کے ڈبے میں ہر شخص گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ خود اور اس کا مزاج سنبھلنا شروع ہوتا ہے۔ پھر برابر بیٹھے ہوئے مسافر سے علیک سلیک ہوتی ہے جو بعض اوقات زندگی بھر کے گہرے مراسم میں بدل جاتی ہے۔ عمر بھر کی دوستیاں ہو جاتی ہیں اور خدا جانے کتنی شادیاں اور کتنے رشتے ان ہی ریل گاڑیوں میں طے ہوئے ہوں گے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جب سے ریل گاڑی چلی ہے، لوگ اپنی بیٹیوں کو دور دور بیاہنے لگے ہیں۔" (۸)

ریل کہانی ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں ریل کے نظام اور پیشے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہر نظام اور پیشے کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو جانے بغیر حالات سے آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ریل گاڑی کے انجن کی طرح، اس سے وابستہ اصطلاحات بھی بھاری بھرکم ہیں مگر عابدی صاحب نے نہایت سبک انداز میں انھیں بیان کیا ہے، اسٹیشن، پلیٹ فارم، ٹکٹ، ہری جھنڈی، جنکشن، ریلوے لائن،

مال گاڑی، گارڈ، کلینر، قلی، فائر مین، سنگل ٹریک، کانٹا، سگنل، ٹکٹ چیکر، سلیپر، برتھ، سٹیم انجن، زنجیر مختصر یہ کہ ایک ثقیل سی فہرستِ الفاظ ہے جو اس سفر نامے میں بار بار استعمال ہوئی ہے مگر عابدی صاحب نے قلم کی روانی کو بروئے کار لاتے ہوئے تحریر کو الفاظ کا کوہِ گراں نہیں بننے دیا۔

عابدی صاحب نے ریل کہانی کو ایک وقیع تحقیقی دستاویز بنادیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جہاں معلومات آفریں کتابوں سے مدد لی ہے، وہاں قلیوں، گارڈوں، ڈرائیوروں، فائر مینوں اور ریلوے کے دیگر ملازموں سے مکالمات کیے ہیں اور ریلوے کے نظام، پلیٹ فارموں کے قیام اور پٹڑی بچھانے کے اہتمام کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کی ہیں۔ انھوں نے خود کو محض 'مطلوبہ معلومات' تک محدود نہیں رکھا، وہ ان ملازموں کے معاملات میں بھی دل چسپی لیتے ہیں اور ان کے احوال اور مسائل کا تذکرہ دردمندی سے کرتے ہیں۔ یوں ریل کہانی میں انسان دوستی کا زاویہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ ایک ریلوے ملازم سے مصنف کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

''میں نے پوچھا۔ ''تو آپ نے کیسی کیسی گاڑیاں چلائیں؟''

''میں نے ساری گاڑیاں چلائیں۔ شٹل بھی چلائی، مال گاڑیاں بھی چلائیں۔ ڈاک گاڑیاں، سب کچھ چلایا۔ ڈیزل بھی چلایا۔ ڈیزل تو میں بمبئی سے لے کر آیا۔ یہ جو ڈیزل چل رہی ہے، بمبئی سے لاتا تھا میں اٹھا کر۔ مجھے بمبئی بھیجتے تھے۔ ایسے ویسے بدھوؤں کو نہیں بھیجتے تھے۔ وہاں ہمارے سامنے انجن کو کرین کے ذریعے جہاز سے اٹھایا اور لائن کے اوپر رکھ دیا۔ بس اسے اسٹارٹ کیا اور ہمیں تین چار نکتے بتادیے۔ ایسا یوں ہوگا، ایسا یوں ہوگا، بس ہم لے کر چلے آئے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کلینر سے فائر مین، پھر شنٹر اور پھر ڈرائیور ہوئے۔ اس ڈرائیوری میں ترقی کیسے ہوتی تھی؟''

بتانے لگے۔ ''اس میں ایسا ہے کہ دو کیڈر ہیں۔ ایک کیڈر ہوتا ہے اپر گریڈ، جس میں گریجویٹ ہوتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے لوئر گریڈ جو بی اے سے نیچے ہوتا ہے۔ تو اس کے امتحان میں اوپر

والے زیادہ جاتے ہیں لیکن امتحان میں نیچے والے زیادہ پاس ہوتے ہیں، کون ہے؟ لوئر گریڈ والے۔ اوپر والے رہ جاتے ہیں۔"(۹)

ریل کہانی مختلف جہات میں سفر کرتی ہوئی روداد ہے۔ ایک جانب وہ ٹرین ہے جس میں مصنف سوار ہے اور وہ زمانہ حال میں رواں دواں ہے، دوسری جانب تاریخ کا پہیہ گھوم رہا ہے اور ہندوستان کے سیاسی حالات بیان ہو رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ٹرین کے آغاز اور ایجاد کی داستان رقم ہو رہی ہے۔ مصنف نے ہندوستان میں ریلوے لائن بچھانے کے بارے میں معلومات محض دامِ شنیدن بچھا کر حاصل نہیں کیں بلکہ متعلقہ تاریخی کتب سے روشنی حاصل کرتے ہوئے مدعا بیان کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ کتابوں کی اس فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جن کا حوالہ کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے جو مصنف کے مستند اور بامقصد طرزِ تحریر کا ترجمان ہے:

"رک سے سبی تک لائن ڈالنے کا کام جس تیزی سے ہوا اس پر خود انجینئر بھی حیران تھے۔

۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء کو وائسرائے کونسل نے قندھار اسٹیٹ ریلوے کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ ۲۱ ستمبر کو تار پہنچا کہ لائن ڈال دی جائے۔ ستمبر کے آخر تک انجینئروں کا عملہ پہنچ گیا اور مزدوروں کی بھرتی شروع ہوئی۔ اوزار بننے لگے، محنت کشوں کی تربیت ہونے لگی، دریائی بند باندھے جانے لگے اور صرف چار مہینوں میں قندھار ریلوے کا پہلا سیکشن فوج کے لیے کھل گیا۔ لیکن آگے ریگستان تھا اور کام زیادہ مشکل تھا۔ اب سبی کی طرف بڑھنے کے لیے لائن کی تعمیر پر ساڑھے تین ہزار مزدور لگا دیے گئے۔ جیسے جیسے وہ کام سیکھتے گئے، کام کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اب حال یہ تھا کہ پٹڑیوں کی ایک جوڑی بچھانے میں صرف دو منٹ لگتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک منٹ میں دو جوڑیاں بچھنے لگیں۔ اوپر سے موسم کے جی میں کیا آئی کہ وہ اچھا ہو گیا۔ موسمِ سرما میں دھوپ خوش گوار ہو گئی۔ صرف ایک بار برفانی ہوا چلی جس میں ایک مزدور جم کر مر گیا لیکن کام کی گرما گرمی میں کمی نہ آئی۔ دسمبر ۱۸۷۹ء میں ایک ماہ میں اسی کلومیٹر لائن پڑ گئی۔ جوں جوں سبی قریب آتا جاتا تھا، مزدوروں کا تجربہ اور کام کی رفتار، دونوں بڑھتے جاتے تھے۔ ۱۸۸۰ء کے پہلے دن صرف آٹھ گھنٹوں میں چار کلومیٹر لائن پڑی۔ ۱۳ جنوری کو یوں لگا جیسے فلم تیز چلا

دی گئی ہو۔ اس روز آٹھ گھنٹوں میں بات تقریباً سات کلومیٹر تک جا پہنچی۔ اور ۱۴ جنوری ۱۸۸۰ء کو اسی لائن نے سبی پہنچ کے دم لیا۔ یہ سارا کام صرف ایک سوایک دن میں پورا ہوا۔'' (۱۰)

عابدی صاحب محض پلیٹ فارم پر چہل قدمی کے قائل نہیں اور نہ ہی ریل کے جھروکوں سے کسی شہر کا نظارہ کرتے ہیں۔ وہ گاہے گاہے شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں کی جانب بھی جا نکلتے ہیں، عوام میں گھل مل جاتے ہیں اور شہر کے کوچہ و بازار اور در و دیوار کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ ان کی اپنی نگاہ بھی خاصی تیز اور دوررس ہے اور وہ ایک ہی نظر میں ماضی اور حال کے دونوں جانب کی تصویر دیکھ لیتے ہیں۔ امرت سر کی عمارات کی تعمیر اور تخریب کی کہانی وہ یوں سناتے ہیں:

''سکھوں کا بسایا ہوا، دُرانیوں کا اجاڑا ہوا اور سکھوں کا دوبارہ بسایا ہوا یہ شہر کبھی کتنا دل کش اور دیدہ زیب رہا ہوگا۔ دورویہ اونچے اونچے مکان تھے جن کی کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ چوکور نہ تھا، سارے کے سارے محرابی تھے۔ نچلی منزل میں اونچے اونچے ستون، بڑے بڑے در اور چھوٹے چھوٹے دریچے، اوپر باہر کی جانب کھلتے ہوئے برآمدے اور کونوں پر شش جہت جھروکے۔ ان میں لکڑی سے تراشی ہوئی محرابیں اور محرابوں پر نقش و نگار اور گل بوٹے۔ باریک کام کی لوہے کی جالیاں اور جنگلے اور یہاں سے وہاں تک کھڑکیوں کے چوبی کواڑ جن پر کبھی وارنش کی گئی ہوگی۔ اب وہ وارنش بری طرح اُڑ چکی تھی، وہ کواڑ بھینچ کر بند کر دیے گئے تھے۔ جھروکوں میں نئے زمانے کی لال اینٹیں چن دی گئی تھیں۔ برآمدوں میں موٹی موٹی چقیں ڈال دی گئی تھیں اور باقی کھڑکیوں کے آگے ٹیلی ویژن، ریفری جریٹر اور بجلی کے پنکھوں کے بڑے بڑے اشتہاری بورڈ کھڑے کر دیے گئے تھے۔ تیسری منزل کے ہوادار کمروں کی کھڑکیوں کے پٹ جھولنے لگے تھے، دیواریں جھکنے لگی تھیں اور اینٹیں اپنے جوڑوں سے نکل کر گرنے لگی تھیں۔ روشن دانوں کے جو شیشے کبھی ٹوٹے ہوں گے، دوبارہ نہیں لگائے گئے تھے اور کمروں کے اندر انسان اور جنگلی کبوتر شیر و شکر ہو کر رہ رہے تھے۔ اوپر سے غضب یہ کہ ہر طرف بجلی اور ٹیلی فون کے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر جانب کھمبے ہی کھمبے لگے ہوئے تھے اور مجھے یقین ہے کہ بارش ہوتی ہوگی تو ٹین کے سائبانوں میں کرنٹ دوڑتا ہوگا۔'' (۱۱)

عابدی صاحب کے اس سفرنامے پر عزیز حامد مدنی کے شعر کا مصرعِ ثانی صادق آتا ہے:

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

عابدی صاحب مصرعِ اول کی سحر کاریوں اور شر انگیزیوں سے تو محفوظ رہے مگر اس سفر نے انھیں طوطی ہزار داستاں ضرور بنادیا ہے۔ انھیں داستان گوئی سے خاص مناسبت ہے اگر چہ ان کے بیان کردہ قصے زورِ تخیل کا نتیجہ نہیں ہوتے، وہ محض لوگوں کے حقیقی واقعات اور تجربات کو اپنے حسین الفاظ میں بیان کرتے ہیں مگر 'حسنِ بیان' سے قبل انھیں 'حسنِ سماعت' کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ واقعات کے انتخاب میں وہ حیرانی، دردمندی اور معلومات آفرینی کو ایک اصول کے طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ذیل میں ایک دل چسپ واقعہ نقل کیا جارہا ہے:

''ایک رات وہ دو برتھوں کے ائرکنڈیشن کمپارٹمنٹ میں سفر کررہے تھے اور دروازہ اندر سے بند کررکھا تھا کہ رات دو بجے کے قریب کسی نے ان کے دروازے پر زور زور سے دستک دی اور شور مچایا کہ دروازہ کھولو۔ دنوں میاں بیوی دہل کر رہ گئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے، وہ دروازہ نہیں کھولیں گے۔ کچھ دیر بعد انھیں محسوس ہوا کہ وہی دروازہ پیٹنے والا شخص برابر کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں وہ ڈیڑھ دو گھنٹے شور مچاتا رہا اور کسی کو گالیاں دیتا رہا۔ صبح جب بیرا چائے لے کر آیا تو ہمارے دوست نے اس سے پوچھا کہ رات یہ کون شخص ڈبے میں گھس آیا۔ بیرے نے بتایا کہ وہ ریلوے کے مجسٹریٹ صاحب تھے اور برابر کے کمپارٹمنٹ میں گشتی عدالت لگا کر بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے لوگوں کو سزائیں سنا رہے تھے۔'' (۱۲)

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو جس کی نوعیت تاریخی ہے:

''یہ قصہ امرت سر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کا ہے۔ یہ پلیٹ فارم مجھ سے پہلے بھی بھلے لوگوں پر ستم ڈھاتا رہا ہے۔ شہر کی تاریخ کا یہ واقعہ اب شاید ہی کسی کو یاد ہو کہ ایک زمانے میں امرت سر

کے باشندے چہل قدمی اور جی بہلانے کے لیے ریلوے اسٹیشن چلے جاتے تھے۔ پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدتے تھے اور اندر جاکر پلیٹ فارم کو سیرگاہ کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ بات سنہ ۱۹۱۹ء کی ہے۔ امرت سر والوں میں یہ شغل اتنا مقبول ہوا کہ پلیٹ فارم پر کھوے سے کھوا چھلنے لگا اور حقیقی مسافروں کو دشواری ہونے لگی۔ جب سیر سپاٹے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تو حکام نے پلیٹ فارم ٹکٹ بند کردیے۔ حالت یہ ہوئی کہ نہ کوئی پلیٹ فارم پر جاکر کسی کو گاڑی پر سوار کرسکتا تھا، نہ کسی کو اتار سکتا تھا۔ اس پر مقامی باشندے مشتعل ہوگئے اور بات اتنی بڑھی کہ امرت سر کے دو سرکردہ باشندوں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی قیادت میں احتجاجی تحریک شروع ہوگئی۔ ان دو حضرات کی مقبولیت بڑھی اور آگے چل کر یہ دونوں بڑے رہنما بنے۔ بہرحال 'پلیٹ فارم ٹکٹ بحال کرو' تحریک کام یاب ہوئی۔ حکام کو شکست ماننی پڑی اور ۱۱ فروری سنہ ۱۹۱۹ء کو اہلِ امرت سر نے پلیٹ فارم ٹکٹ کی بحالی کا جشن منایا۔" (۱۴)

ریل کہانی میں راکب اور مرکب کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ یہ کہانی دل چسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی!

عام طور پر 'سرکاری دورے' اچھے 'سفرنامے' بننے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح غیرسرکاری میزبان کی مہمان نوازی، سفر کو وسیلہ ظفر تو بنا سکتی ہے مگر سفرنامے کو معتبر نہیں بنا سکتی۔ عابدی صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے سفر میں تخلیقی امکانات دریافت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کا سفرنامہ جہازی بھائی بھی ایک ایسی ہی کاوش ہے، جس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ ماریشس میں منعقد ہونے والی غالب کانفرنس میں عابدی صاحب کو ایک سخن فہم کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ وہ ایک جہاز پر ماریشس کے ایئرپورٹ پر اترتے ہیں اور جب واپسی پر دوبارہ جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں جہازی بھائی کے اوراق ہوتے ہیں۔ دراصل اس نام کے پس منظر میں ایک دل خراش تاریخی داستان ہے۔ غلامی کے جہاز پر ہزاروں ہندوستانیوں کو مزدوری کے لیے ماریشس لایا گیا۔ جہاز پر بیٹھے ہوئے بے اختیار لوگ باہم 'جہازی بھائی' کہلائے۔ یہی اس تصنیف کی 'وجہ تسمیہ' ہے۔ مصنف اور ایک نوجوان کے مابین مکالمے میں یہ روداد یوں بیان ہوئی ہے:

''ہاں، وہ لوگ اس جزیرے کو ماریچ کہتے تھے۔ ہاں تو میرے دادا کے دادا ۹ جون کو پہنچے تھے۔ اس وقت ان کی عمر انیس سال تھی۔ ذات کے مسلمان تھے۔ قد چھوٹا تھا۔ ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ اس کے والد کا نام تا جو تھا۔ غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ۲۱ جون ۱۸۹۹ء کو مرے تھے۔ اب تک لال سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔''

میں اس کی باتوں میں کھو گیا اور سلیپر پہننا بھول گیا۔ ''کہاں لکھا ہے لال سیاہی سے؟ تمہیں اپنے دادا کے دادا کی اتنی اتنی سی تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟''

''سب رجسٹروں میں لکھی ہوئی ہے۔ ۷۵ برس میں ساڑھے چار لاکھ مزدور جہازوں میں بھر بھر کر بمبئی، مدراس اور کلکتے سے یہاں لائے گئے۔ بندرگاہ پر اتار کر وہ قطاروں میں کھڑے کر دیے جاتے تھے۔ گورے لوگ بڑے بڑے رجسٹر کھول کر بیٹھتے تھے اور ہمارے بزرگوں کے بارے میں یہ تمام باتیں درج کرتے تھے۔ خوش نویس گوروں کے لکھے ہوئے وہ سینکڑوں رجسٹر آج تک محفوظ ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟''

''مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں۔ آپ ضرور دیکھیے۔ دیکھنے کی جگہ ہے۔ ہم جتنے ہندوستانی یہاں آباد ہیں۔ سب کے باپ دادا کا حال اور ذات پات کا حال وہاں درج ہے۔ بل کہ جو لوگ کیمرہ آنے کے بعد آئے ان سب کی تو تصویریں بھی رجسٹروں میں چپکی ہوئی ہیں۔ ذرا جا کر دیکھیے۔ خاص طور سے ان کی آنکھوں میں چھپا ہوا احساس ضرور دیکھیے۔''

''جہازی بھائی تھے وہ؟''

''ہاں۔ ان کے رنگ روپ الگ تھے، دین اور مذہب الگ تھے۔ بولیاں جدا تھیں۔ لہجے مختلف تھے۔ سب ایک ہی جہاز میں ٹھونس دیے جاتے تھے۔ دو چار روز انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ بالآخر بولتے تھے تو آپس میں ایک دوسرے کو جہازی بھائی کہہ کر بلاتے تھے۔'' (۱۴)

یہ ابتدائی مکالمہ بعد ازاں متعدد مکالمات کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور بہت سی تلخ معلومات کے حصول کا باعث بھی۔ مصنف کو ماریشس آ کر معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ بیرونی حملہ آوروں کی مشقِ ستم کا تختہ رہا ہے۔ سب سے پہلے عرب حملہ آور ہوئے، پھر پرتگالی غضب ناک ہوئے۔ ان کے بعد ولندیزی خراج مانگنے آئے۔ وہ رخصت ہوئے تو فرانسیسی قبضہ جمانے آ گئے۔ اہلِ فرانس کو انگریز نے شکست فاش دی۔ انگریز کی حکومت قائم ہوئی تو غلامی کا ایک نیا باب رقم ہوا اور ماریشس میں ہندوستان کے علاوہ گویانا، ٹرینیڈاڈ، جنوبی افریقہ، سرینام اور فیجی سے غلام 'درآمد' کیے گئے۔ ان غلاموں سے جانوروں سے بدتر سلوک کیا گیا۔ آخر ۱۸۳۵ء میں برطانوی پارلیمان نے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا اور بدنصیبوں کو رہائی نصیب ہوئی۔ مصنف نے اس موقع پر تحریر کیا ہے:

> ''گردن سے غلامی کا طوق اترنا تھا کہ جزیرہ میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ آزادوں نے پہلا نعرہ یہ لگایا کہ بس بہت ہوا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر جو چلے تو افق پار اتر گئے؟ اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ گنے کی فصل بڑھی، تیار ہوئی اور جہاں کھڑی تھی وہیں ڈھے گئی۔ ماریشس کی ہواؤں میں آقاؤں کے گھونسے لہراتے رہے اور ماریشس کے سناٹوں میں فرانسیسی گالیاں گونجتی رہیں۔ جزیرہ مزدوروں سے خالی ہو گیا۔''(۱۵)

سفرنامے کے آغاز میں فضا خاصی افسردہ رہتی ہے۔ مصنف نے ماریشس کی تاریخ کے تلخ باب کے بیان میں دردمندی اور دل سوزی کا اظہار کیا ہے۔ تاریخ کا یہ تذکرہ قدرے طویل ضرور ہے مگر یہ تصنیف کو ایک سیاق وسباق فراہم کرتا ہے اور قارئین کو ماضی کے گم شدہ اوراق سے متعارف کراتا ہے۔

مصنف جب ماضی سے حال میں قدم رکھتا ہے تو تاریک بادل چھٹنے لگتے ہیں اور روشن کنارہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ مصنف کے افسردہ دل کی کلی بھی کھل اٹھتی ہے اور وہ بے تکلفی اور زندہ دلی کے ساتھ داستانِ سفر بیان کرنے لگتا ہے۔ آغازِ سفر میں عابدی صاحب کو 'صحبتِ ناجنس' کے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے جسے وہ لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں:

''مجھے بڑے سے جمبو جیٹ میں کھڑکی والی نشست ملی تو میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے یہ دعا نہیں مانگی کہ باقی سفر ساتھ خیریت کے گزرے بلکہ یہ التجا کی کہ اچھے مسافروں کے ساتھ گزرے۔ شاید میں وقتِ دعا تشریح کرنا بھول گیا۔ کسی کلیسا کی دو موٹی موٹی راہبائیں سامان سے لدی پھندی آئیں اور پہلے خود برابر والی دو نشستوں میں دھنسیں اور پھر اپنا فالتو سامان اپنے پیروں تلے ٹھونس ٹھانس کر حفاظتی پٹیاں باندھ لیں اور پھر اپنے موٹے موٹے چشموں کے دریچوں سے مجھے دیکھا اور آواز سے آواز ملا کر بولیں: ''بونژو''

بس، یہاں سے ایک طویل سزائے قید کا آغاز ہوگیا۔ اب میرے اپنی نشست سے اٹھ کر باہر نکلنے، ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے اور وہ جو ہوائی اڈے پر چائے پی تھی اسے ٹھکانے لگانے کے تمام راستے مسدود تھے۔ اپنی دوسری دعا میں نے ذرا تفصیل سے مانگی کہ چوں کہ سفر بہت طویل ہے اس لئے اب تک میں نے جتنے سیال مادے بدن میں اتارے ہیں وہ وہیں کہیں اندر ہی کھپ جائیں یا پھر جلد کے مساموں کے راستے بھاپ بن کر اڑ جائیں۔ پھر میں نے یہ اہتمام بھی کیا کہ راستے بھر کھانا تو کھایا، پانی نہیں پیا۔''(۱۶)

مصنف نے شگفتہ انداز میں ''واقعہ سخت ہے اور جان عزیز'' کا مضمون باندھا ہے۔ یہ اقتباس 'مضحک صورتِ واقعہ' کی عمدہ مثال ہے۔

عابدی صاحب نے جہاں ماریشس کے ماضی پر روشنی ڈالی ہے وہاں زمانہ حال کی تصویر بھی کھینچی ہے۔ وہ لوگوں سے ماریشس کے دین و مذہب کا پوچھتے رہے اور قارئین کو بتاتے رہے۔ انھوں نے ماریشس میں اسلام کی صورتِ حال کو موثر انداز میں روشناس کرایا ہے تاہم وہاں کے مولوی صاحبان کا 'ذکرِ خیر' کرتے ہوئے وہ اچھے خاصے شدت پسند ہوجاتے ہیں۔ عابدی صاحب نے وہاں کے مسلمانوں کے سماجی مسائل کو بھی رقم کیا ہے، خاص طور پر غیر مسلموں سے شادی کے معاملات کو انھوں نے دردمندی سے پیش کیا ہے کہ ایسے رشتے، شاخِ نازک پہ بنے ہوئے آشیانوں کی طرح ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں۔ رشتوں کی ناپائیداری، شادیوں کی ناکامی، مرد کی فریب کاری اور عورت کی

ناقدری کو انھوں نے ایک باشعور اور صاحبِ دل فرد کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا قلم آب دیدہ ہوجاتا ہے اور ان کا تانیثی شعور اجاگر ہوکر سامنے آتا ہے۔

عابدی صاحب نے ماریشس میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کو بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے مگر انھوں نے پاکستانی سفارت خانے کی قومی زبان سے بے اعتنائی اور بے تعلقی کو بجا طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے غالب کانفرنس کی روداد بھی بے تکلف اسلوب میں تحریر کی ہے۔ ماریشس کی سیاست اور معاشرت پر بھی مختصر تبصرے کیے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے پسندیدہ پھلوں آم، الٰچی اور پپیتے کا مزے لے لے کر ذکر کیا ہے۔ بریانی کے ذائقے کے بارے میں وہ رطب اللسان رہتے ہیں۔ مصنف نے وہاں کے مشہور اور طویل و عریض سر سیوو ساگر رام غلام بوٹینیکل گارڈن کے ہزار ہا شجرِ سایہ دار کا نظارہ بھی دکھایا ہے۔

ماریشس میں عابدی صاحب چند روز مہمان رہے۔ اس دوران میں انھوں نے نہ صرف حقِ نمک ادا کیا بل کہ حق تو یہ ہے کہ ماریشس کے بارے میں ایسے سماجی اور تاریخی حقائق سے آگاہ کیا جن سے اردو دنیا اس سے قبل ناآشنا تھی۔

رضا علی عابدی سڑک پر گام زن ہوں، ریل کی سیٹ پر براجمان ہوں، محوِ پرواز ہوں یا دریا کے کنارے کنارے چل رہے ہوں؛ قلم کی روانی صاحبِ قلم سے تیز تر رہی ہے ____ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا!

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) رضا علی عابدی، جرنیلی سڑک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص۴۳

(۲) رضا علی عابدی، شیر دریا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص۸۹،۸۸

(۳) ایضاً، ص۲٦۸

(۴) ایضاً، ص۲۹۲،۲۹۱

(۵) ایضاً، ص٦۴،٦۲

(٦) ایضاً، ص۸۰

(۷) ایضاً، ص۱۹۳

(۸) رضا علی عابدی، ریل کہانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص۸،۷

(۹) ایضاً، ص۱۴۳

(۱۰) ایضاً، ص۳۴

(۱۱) ایضاً، ص۱۳۳

(۱۲) ایضاً، ص۱۸۹

(۱۳) ایضاً، ص۱۳٦

(۱۴) رضا علی عابدی، جہازی بھائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰٦ء، ص۱۴،۱۳

(۱۵) ایضاً، ص۲۵

(۱٦) ایضاً، ص۳۱

❁❁❁